مولانا محمد حنیف ندوی

اسفارِ خمسہ

اس سے پہلے ہم اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں کہ عہد نامہ قدیم و جدید کے بارے میں مستشرقین کی تحقیقات عالیہ یا تنقیدات عالیہ نے جن نتائج کی نشان دہی کی وہ اپنی جگہ حد درجہ لائقِ ستائش ہیں۔ تنقید و تفحص کے اس ڈھب کا آغاز کیونکر ہوا؟ اس کی تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ ٹی، ایچ رابنسن (T.H. ROBINSON) نے اس داستان کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ ہوا یوں کہ سنڈے سکول کے ایک گروپ نے جب وعظ و تلقین کے لیے حضرت یوسفؑ کے قصہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اس میں نہ صرف تکرار، اضافہ اور اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ ایسے تضادات بھی موجود ہیں جن کو آسانی سے رفع نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اسی نقطۂ نظر سے جب انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا تو ان میں بھی اختلاف و تضاد کی لاینحل صورتیں فکر و نظر کے سامنے آئیں۔ رچرڈ سائمن (RICHARD. SIMON) نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ انکشاف کیا، کہ اس طرح کے تمام قصص میں نہ صرف تکرار و تضاد پایا جاتا ہے۔ بلکہ اسلوب و طرزِ بیان یا زبان کا اختلاف خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تحقیق و تنقید کے اس انداز نے تنقیداتِ عالیہ کی طرح ڈالی جس نے آگے چل کر ایک مستقل فن و علم کی شکل اختیار کر لی۔ ایسے فن و علم کی جس نے عہد نامہ قدیم و جدید کی چھان بین کے سلسلے میں معیار اور کسوٹی کا کام دیا۔ اس فن کی کاوشوں سے اسفارِ خمسہ[۲۹] کے متعلق جو حقائق منکشف ہوئے، ان کو کچھ اس ترتیب سے بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ "اسفارِ خمسہ" کے جو نام سرِ عنوان درج کیے گئے ہیں یہ ان کے اصلی نام نہیں بلکہ یہ یونانی مآخذ سے لیے گئے ہیں۔ عبرانی نسخہ میں ہر کتاب کے ابتدائی و افتتاحی الفاظ کو عنوان ٹھہرایا گیا ہے۔

۲۔ ان کتابوں کی تدوین کو وحی کا نتیجہ سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ ان میں بنیادی اختلافات رونما ہیں تحقیق و تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مدوّن ایک نہیں بلکہ دو یا اور کئی ہیں۔ مضامین میں ان کی چھاپ نمایاں ہے۔

---

[۲۹] یعنی پیدائش، خروج، احبار گنتی اور استثنا۔

۳- یہ کتابیں، وحی والہام کی طرفہ طرازیوں کی مرہونِ منت نہیں - اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ان میں خدائے پاک کے لیے دو مختلف نام آتے ہیں - ایک الوہیم (ELOHIM) کا اور دوسرے یہوی (JEHVAN) کا - اس حقیقت کے انکشاف کا سہرا آسٹروس (ASTRUC) نامی ایک فرانسیسی رومن کیتھلک طبیب ومعالج کے سر ہے جس نے ۱۷۵۲ میں اس عظیم انکشاف سے پوری مسیحی دنیا کو چونکا دیا، کہ ان دو مختلف ناموں کے حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسفار کی ترتیب و تدوین میں کم از کم دو فکری ذہن کارفرما رہے ہیں - ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کے دو الگ الگ مآخذ ہیں - ان مآخذ کو اہلِ فن وتحقیق ای (E) اور پی (P) کے الفاظ و رموز سے تعبیر کرتے ہیں - افسوس یہ ہے کہ اسفارِ خمسہ کے یہ دونوں مآخذ تاریخ کی ستم ظریفیوں کی نذر ہو چکے ہیں - اس لیے اب ہمارے پاس ایسا کوئی علمی ذریعہ باقی نہیں رہا جس کے بل پر ہم یہ جان سکیں کہ اسفارِ خمسہ کے موجودہ نسخوں میں، اصل سے کہاں تک انحراف کیا گیا ہے -

۴- اسفارِ خمسہ کے دقیق مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان میں متعدد بار حک و اصلاح سے کام لیا گیا ہے - اور ایسی اصلاحات روا رکھی گئی ہیں جن کا اصل متون سے کوئی تعلق نہ تھا -

۵- ان کتابوں پر غور و فکر کے بعد علم و تحقیق کے حلقوں میں ان کے بارے میں اس حد تک بدگمانی بڑھی کہ ۱۷۹۲ میں ایک جرمن فاضل جوشیا (JOSHIAA) نامی مجبور ہو گیا کہ ان سے متعلق ایک تحقیقی وتنقیدی نسخہ شائع کرے، جس میں ایک تو ان کتابوں پر تنقید ہو - دوسرے ان بیانوں کی تشریح کی جائے جن کی مدد سے ہم اس لائق ہوتے کہ ان کتابوں کے بارے میں نئے اندازِ نظر کو پیش کر سکیں -

گو اول اول تنقید و تفحص کا ہدف یہ پانچ کتابیں ہی رہیں - لیکن تنقیداتِ عالیہ کی بدولت یہ سلسلہ دراز ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا عہد نامہ قدیم و جدید اس کی لپیٹ میں آ کے رہا۔ کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ جانچ پرکھ کی جو کسوٹیاں ایک مرتبہ ضبطِ تحریر میں آگئی تھیں، ان سے مزید استفادہ نہ کیا جاتا - اور یہ نہ دیکھا جاتا کہ بائبل میں کہاں کہاں گھپلا ہے، کہاں کہاں اضافہ ہے اور کہاں کہاں تضاد، تکرار اور اصلاحات نے ان کے متن کو متاثر کیا اور بدلا ہے [30]

اسلوب و اندازِ بیان کے فرق کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم کہیں گے کہ حقائق دینیہ اور

---

[30] اس ساری بحث کے لیے ایبو کومنٹری آن ہولی سکرپچر میں ارتھ (L.EDERITH) کا طویل اور فاضلانہ مقالہ دیکھیے جس کا آغاز کتاب کے صفحہ ۲۲ سے ہوتا ہے -

تاریخی واقعات قصص کے سلسلے میں ان ماخذ نے الگ الگ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔
مثلاً ایک ماخذ ایسا ہے جس نے حقائق دینیہ کو جس صورت میں بیان کیا ہے، اس میں پختگی اور فکری نضج سرے سے مفقود ہے۔ جب کہ دوسرے ماخذ سے قدرے تفصیل اور ارتقا کا پتا چلتا ہے۔
یعنی ایک ماخذ میں اللہ تعالیٰ کا تصور سادہ، خام اور بشریاتی، لیکن موحدانہ ہے اور دوسرے ماخذ میں یہی تصور قدرے ماورائی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس میں توحید کی جھلک تو ہے مگر یہ ایسی توحید ہے جس کا کائنات اور انسان سے کوئی تعلق نہیں۔
اسی طرح قربانی کے بارے میں ان کتابوں میں دو طرح کے تصورات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک تصور یہ ہے کہ قربانی ایک عام فریضہ ہے جس کا تعلق کسی گروہ یا مقام سے نہیں۔ اور دوسرا تصور یہ ہے کہ قربانی پیش کرنے کا حق صرف مبلغین یہودیت کو ہے، دوسروں کو نہیں۔ اور یہ کہ اس کے لیے مقامات مخصوص و متعین ہیں۔ ہر جگہ قربانی پیش کرنا درست نہیں۔
تاریخ اور قصص کے بارے میں بھی ان کتابوں میں خاصہ اختلاف رونما ہے۔ بعض جگہ آدمؑ و حواؑ کی تخلیق و آفرینش کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ دونوں بیک وقت خلعتِ وجود سے آراستہ ہوئے۔ اور بعض جگہ اسی واقعہ کو اس رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ ان کی تخلیق الگ الگ زمانوں میں ہوئی یعنی پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے اور پھر جب ان کو اپنی تنہائی کا احساس ہوا تو ان کی دلجمعی اور تسکین کے لیے حضرت حواؑ کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔[13]
اس مرحلہ پر ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ حضرت حواؑ کو آدمؑ کی پسلی سے کیوں کر پیدا کیا گیا۔ یہ بات بھی زیر بحث نہیں کہ تخلیق انسانیت کے اس تصور کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر کس طرح صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے کیوں کہ نظریۂ ارتقا کی ابھی تک کوئی ایسی تعبیر و تشریح پیش نہیں کی جا سکی جو اہلِ تحقیق کے تمام حلقوں میں یکساں مقبول و مسلّم ہو۔ ہم یہاں صرف دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔
ایک یہ کہ اسفارِ خمسہ میں تاریخ تخلیق و آفرینش کے واقعہ کو دو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے اور اسلوبِ بیان کے اس اختلاف سے دو مختلف معانی کا استنباط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر صورت واقعہ یہ ہے کہ پہلے آدمؑ کو پیدا کیا گیا اور پھر محض ان کی رفاقت و تسکین کے لیے حضرت حواؑ کی تخلیق ہوئی تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حضرت حواؑ کی تخلیق میں براہِ راست کوئی حیاتیاتی عنصر کارفرما

---

[13] ایضاً

نہیں تھا بلکہ ان کو محض اس بنا پر پیدا کیا گیا کہ یہ حضرت آدمؑ کی تسکینِ خاطر کا باعث ہوں۔

اب رہا یہ سوال کہ ان حقائق کی روشنی میں عہد نامۂ قدیم کا بہ حیثیت مجموعی کیا مقام و موقف متعین ہوتا ہے، تو اس کا جواب واضح ہے۔ اس کے سرسری مطالعہ ہی سے جو نکات ابھر کر نظر و فکر کی سطح پر آشکار ہوتے ہیں، ان میں تین چیزیں بہرحال نمایاں ہیں۔

۱۔ یہ کہ اس میں جن نظریات کو پیش کیا گیا ہے اور جس قانون و تشریع کی وضاحت مقصود ہے اس کی بنیاد روحانیت کی بجائے قومیت کی تنگ نظری اور دنیوی فلاح و بہبود کے محدود اسباب و وسائل پر ہے، اس میں وسیع تر انسان دوستی اور قلب و روح کی پاکیزگی کا عنصر یکسر مفقود ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ کا تصور بھی حد درجہ ناقص ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف بشریاتی رنگ کا امتزاج صاف نظر آتا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کو انسانیت یا کائنات کی پرورش و بقا سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کا وجود باجود صرف اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کی دنیوی فلاح و کامرانی کا خیال رکھے اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے۔ ان کو شکست دے اور ان سے انتقام لے۔

۲۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں زندگی کے تسلسل یا غیر فانی عنصر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی یعنی اس کی تعلیمات میں اس امر کی وضاحت نہیں پائی جاتی کہ موت کے بعد ہمیں زندگی کے ایک اور تجربہ سے دوچار ہونا ہے، جس کا تعلق اس دنیا کے اعمال و عقائد سے ہے۔ عہد نامۂ قدیم میں قیامت کے معنی صرف یہ ہیں کہ آخر آخر میں یہودیوں کو فتح نصیب ہوگی اور ان کے دشمن شکست سے دوچار ہوں گے۔

۳۔ عہد نامہ قدیم کی ترتیب و تسوید میں حصہ لینے والے انبیا کا ذکر کچھ اس انداز سے ہے کہ یہ لوگ کہانت کی ادنیٰ سطح سے اونچا نہیں اٹھ سکے، اور نبوت و رسالت کی ان بلندیوں پر فائز نہیں ہو سکے جہاں ان پر سینۂ جبریل کے راز فاش ہوتے ہیں، جہاں ان کے کردار و عمل کے گوشے جگمگا اٹھتے ہیں اور یا جہاں پیغمبر براہِ راست اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مزاج، کردار اور اسلوبِ بیان بالکل وہی ہے جو معمولی کاہنوں کا تھا۔ اس کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

تنقیداتِ عالیہ نے اس سلسلے میں کن حقائق پر روشنی ڈالی اور تحقیق و تفحص کے جدید پیمانوں =

کیا نئی حقیقتیں علم و عرفان کی زینت بنیں۔ اس کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عہد نامہ قدیم بتدریج تکمیل پذیر ہوا ہے اور اس کی تدوین میں مختلف ذہن، مختلف اسلوب اور مختلف خیالات و افکار کارفرما رہے ہیں۔

۲۔ اوّل اوّل ان میں پیش کردہ تعلیمات کا مزاج یکسر دنیوی اور قبائلی و قومی تھا اور پھر آہستہ آہستہ ان میں مذہبی و دینی رنگ ابھرا۔ یہ دراصل عبرانیوں کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کی تاریخ ہے اور اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ حضرت مسیح سے کوئی دو سو سال قبل تک اس قوم کے رہنماؤں، پیغمبروں اور کاہنوں نے کیا سوچا اور کس طرح کی اجتماعی و انفرادی زندگی بسر کی۔ یہی تاریخ جس کا مزاج یکسر دینی تھا آخر آخر میں دین و مذہب کے سانچوں میں ڈھلی۔

۳۔ اس میں ایک حصہ تشریع و قانون کا ہے اور ایک حصہ واضح طور پر تاریخ کا۔ فلو نے حضرت مسیح سے چالیس سال بعد عہد نامہ قدیم میں سے صرف اسی حصہ پر اعتماد کیا ہے جس میں یہودی شریعت کی وضاحت و تفصیل درج ہے اور اسی پر اپنی تمام تر تحریرات کی بنیاد رکھی ہے۔ باقی حصہ جس میں تاریخ یا کائنات کے بارے میں نیم علمی اور ابتدائی نوعیت کی معلومات درج ہیں ان کو چنداں اہمیت نہیں دی۔

۴۔ اس کے ماخذ غیر معلوم اور غیر محفوظ ہیں۔

۵۔ ان کی اصل زبان سریانی یا عبرانی تھی اور اب جو عبرانی نسخہ رائج ہے وہ محض یونانی ترجمہ شدہ ہے۔ ترجمہ کے بارے میں اس پیش پا افتادہ حقیقت سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جسے لسانیات سے ذرا بھی مس ہے کہ اس میں اصل متن کے تمام پہلو کبھی بھی اصابت و تعین کے ساتھ منعکس نہیں ہو پاتے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اس سے یا تو اصل متن و عبارت کے بعض بنیادی پہلوؤں کا سرے سے اظہار ہی نہیں ہو پاتا، اور یا پھر کچھ نئے پہلو خود بخود ابھر آتے ہیں، جن کا اصل متن و عبارت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک یہ کہ ہر زبان کا اپنا ایک انداز اور ڈھب ہے اور یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ترجمہ کرتے وقت ہم کسی بھی زبان کی خصوصیات کو دوسری زبانوں میں بعینہٖ منتقل کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کی ذہنی سطح دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے اگر ایک ہی عبارت کا دو شخص الگ الگ ترجمہ کریں گے،

تو ان دونوں میں اختلاف رونما ہونا قدرتی ہے۔

۶۔ ان کتابوں کو جو عہد نامہ قدیم میں درج ہیں، جب الہامی قرار دیا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ یہ مبرّا عن الخطا ہیں، کیونکہ ان میں چھان بین، حذف و اضافہ اور تضاد کا عمل ہمیشہ جاری اور کارفرما رہا ہے۔ الہامی ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ ان کو ایک خاص دینی یا الٰہی شعور اور ذوق اور بلند تر جذبات و کیفیات کے زیر اثر ترتیب دیا گیا ہے۔ اور اسی شعور و ذوق کی روشنی میں اس میں حک و اضافہ کے عناصر حرکت کناں رہے ہیں۔[۳۲]

---

[۳۲] ان معلومات کے لیے دیکھیے لفظ بائیبل۔ انسائیکلوپیڈیا ریلجن اینڈ ایتھکس اور نیو کومنٹری کے ابتدائی ابواب۔

بقیہ تاثرات:

کہ اس مملکت میں اسلامی نظریۂ حیات کو عملی شکل دی جائے گی۔ نظری طور پر تو ہم اس عظیم مقصد کے دعویدار رہے لیکن عملاً اس سے بے اعتنائی برتی اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جب تک ہم اسلامی اخوت اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ اور سیاسی و اقتصادی نظام قائم نہیں کریں گے اپنے اس مقصد سے بہت دُور رہیں گے۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے ربع صدی بعد نئے دستور کے نفاذ سے اس جانب بہت اہم عملی قدم اٹھایا گیا ہے اور اب اس کام کو منزلِ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ قائدِ اعظم کی یاد تازہ کرنے والے سیمینار نے ہمیں اپنے اسی اہم فرض کی ادائی پر توجہ دلائی ہے۔

(رزاقی)